باسمہٖ تعالیٰ

بتقریب یومِ پاکستان ۱۹۸۲ء

پاکِستان کا تصوّر کس نے دِیا تھا؟

یہ نہ قادیانیت کی تخلیق تھا، نہ انگریز کی سازش

خان عبدالولی خان کے الزام کی حقیقت

پرویز

چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

افسانے اور حقیقت

نظیری! کاش بنمائی کہ در ساغر چہ می داری
کہ پیشِ زاہداں قدرِ گنہگاراں شود پیدا

عزیزانِ گرامی قدر! السلام علیکم

۲۳ مارچ کا دن، ہماری ملی زندگی میں ابدی اہمیت کا حامل ہے۔ (آج سے بیالیس سال پہلے) اس روز ہم نے حصولِ آزادی کے عزم کا اعلان کیا تھا۔ آزادی کی عظمت و اہمیت کس قدر ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب حضور نبی اکرمؐ، ہجرت کے بعد، مدینہ تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ یہودی عاشورہ کا روزہ رکھتے ہیں۔ دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ اس روز بنی اسرائیل نے فرعون کی غلامی سے آزادی حاصل کی تھی۔ ہم اس کی یاد میں جشنِ مسرت مناتے اور شکرانے کا روزہ رکھتے ہیں۔ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ ہمیں بھی اس دن کا روزہ رکھنا چاہیئے کیونکہ کسی قوم کا مستبد انسانوں کی محکومیت سے رستگاری حاصل کر لینا، اسی قوم کے لئے باعثِ مسرت نہیں۔ یہ پوری کی پوری نوعِ انسان کے لئے وجہِ فخر و انبساط ہے۔ غلامی انسانیت کے لئے وجہِ تذلیل ہے، اور آزادی، آدمیت کے لئے باعثِ سرفرازی۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ دین کی منزل اَلْعَقَبَةُ کے مرادف ہے۔ یعنی پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنے کے مرادف۔ اتنا کہنے کے بعد فرمایا: وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ...... (۹۰/۱۲) "تمہیں کچھ معلوم ہے کہ "پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنے" سے مراد کیا ہے؟ نہیں معلوم تو سن لو کہ اس سے مراد ہے: فَكُّ رَقَبَةٍ...... (۹۰/۱۳) "نوعِ انسان کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانا۔" یہ ہے الدین کی منزل کا قدمِ اوّل[1]۔ خود حضور نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ...... (۷/۱۵۷) "وہ ان زنجیروں کو توڑ دے گا جن میں نوعِ انسان جکڑی چلی آ رہی تھی، اور ان کے سر سے ان سلوں کو اتار پھینکے گا جن کے بوجھ تلے وہ دبی ہوئی تھی۔" اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اسلام میں آزادی کی قدر و قیمت کیا ہے، اور اسی سے پھر اس کا بھی اندازہ

[1] یہ تو ہے قرآن کی رُو سے غلامی کی کیفیت' اور ہماری مذہبی پیشوائیت' غلام اور لونڈیوں کو عین مطابقِ اسلام قرار دیتی ہے!

لگا لیجئے کہ ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کی اہمیت کیا! میرے لئے تو اس تقریب کی یاد ایک اور جہت سے بھی فردوسِ قلب و دماغ ہے کہ میں اُس عدیم النظیر نظارہ میں خود شامل تھا جس میں اس عزمِ آزادی کا اعلان کیا گیا تھا اور اس معرکۂ آرائی میں شریک جس کا فاتحانہ انجام حصولِ پاکستان تھا — جس جگہ اب مینارِ پاکستان سرفراز ہے۔ وہاں مسلم لیگ کے اجلاس کا پنڈال ایستادہ تھا اور اس کے باہر طلوعِ اسلام کا خیمہ نصب تھا جو سیاسی مذاکرات کی آماجگاہ تھا۔ میں بھلا زندگی کی ان حسین ساعتوں کو کیسے فراموش کر سکتا ہوں؟

لیکن آزادی کی قدر و قیمت تو وہی قوم جان سکتی ہے جس نے اسے خون کی قیمت دے کر حاصل کیا ہو! جس قوم کو، ایک قطرۂ خون بہائے بغیر، ایسی عظیم مملکت مفت میں مل جائے، وہ نہ اس کی قدر و قیمت جان سکتی ہے، اور نہ اُس محسنِ ملت کا مقام پہچان سکتی ہے، جس نے اسے اس متاعِ بے بہا کا مالک بنا دیا۔ یہی نہیں کہ اس قوم نے اس محسن کے مقام کو نہیں پہچانا، اس نے اس کی عظمت کو داغدار کرنے میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے، ۲۵ر دسمبر ۱۹۸۱ء کو "قائداعظمؒ" کے یومِ پیدائش کی تقریب پر اپنے خطاب میں کہا تھا کہ جن لوگوں نے مطالبہ اور حصولِ پاکستان کی جدّ و جہد کی انتہائی مخالفت کی تھی، وہ تشکیلِ پاکستان کے بعد ہجوم کر کے ادھر آ گئے، اور یہاں اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے مختلف سازشوں اور کاوشوں میں مصروفِ عمل ہیں[1]۔ انہی میں خان عبدالولی خان کا وہ شگوفہ ہے جو انہوں نے حال ہی میں چھوڑا ہے۔

وسوسہ انگیزی

قرآنِ کریم نے تیس پاروں میں اپنی تعلیم اور پیغام کو مکمل کر دینے کے بعد، آخری سورۃ میں، اُمتِ مسلمہ کو متنبہ کیا ہے کہ تم، ان لوگوں کے خطرہ سے محتاط رہنا۔ —يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ...... (۱۱۴/۵) جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ کی چنگاری ڈال دیتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، قرآن کی رُو سے، اُمت کے لئے سب سے بڑا خطرہ وسوسہ اندازی ہے۔ اور خان ولی خان نے اسی حربہ سے کام لیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہمارے عوام دو باتوں سے چڑتے (ALLERGIC) ہیں۔ اور انہیں بجا طور پر ایسا ہونا بھی چاہیئے۔ یعنی قادیانیت اور انگریز پرستی۔ جونہی کسی نے کہا کہ فلاں سکیم، قادیانیوں کی تراشیدہ ہے اور اس کا پیش کرنے والا انگریز کا آلۂ کار، تو عوام، اسے برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ خان ولی خان نے اپنے انٹرویو میں (جو سب سے پہلے، ہفتہ وار چٹان کی ۲۱ر دسمبر ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا) جو کچھ کہا اس کا ملخص یہ تھا کہ قائداعظمؒ نے جو سکیم، مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء میں پیش کی تھی وہ درحقیقت

انگریزیت اور قادیانیت

سر ظفر اللہ خان کی تخلیق تھی، جو اس زمانے کے وائسرائے لارڈ لنلتھگو کی تصویب کے ساتھ، ۱۲ر مارچ ۱۹۴۰ء کو مسٹر محمد علی جناح کو بھیجی گئی تھی۔ آپ نے غور فرمایا کہ خان صاحب نے، قائداعظمؒ کے خلاف جذبۂ حقارت

---

[1] یہ خطاب اب پمفلٹ کی شکل میں شائع ہو گیا ہے جس کا عنوان ہے "تحریکِ پاکستان کے مخالف علماء"۔

اجاگر کرنے کے لئے، انہیں کس طرح دو تیروں کا ہدف بنایا! قائداعظمؒ کا سب سے بڑا معرکہ آرا کارنامہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان ہے۔ اس قرارداد کے متعلق یہ تاثر پیدا کرنا کہ وہ ایک قادیانی (سر ظفر اللہ خان) کی وضع کردہ، اور انگریز کی منشا کے مطابق تھی، جس قدر خطرناک سازش ہو سکتی ہے، ظاہر ہے۔ خان صاحب، اپنے سیاسی کردار میں جس خصوصیت کو سب سے زیادہ وجۂ افتخار قرار دیتے ہیں وہ یہی ہے کہ وہ انگریز کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ اپنے آپ کو انگریز کا دشمن، اور جناحؒ کو انگریز کا آلۂ کار ٹھہرانے سے اپنی جس آتشِ انتقام کا ٹھنڈا کرنا مقصود ہو سکتا ہے، ماہرینِ نفسیات اس کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ باقی رہا یہ کہ اس سکیم کے ایک قادیانی کی طرف منسوب کرنے سے عوام کے دل میں کس قسم کے جذباتِ نفرت اُبھر سکتے ہیں، اس کے لئے وہ ایک شہادات کا پیش کیا جانا کافی ہوگا۔ واضح رہے کہ میں ان شواہد کو محض حقائق کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔ ان سے کسی کا استخفاف مقصود نہیں۔

(۱) سر ظفر اللہ خان جس مذہب کے پیرو ہیں، اس کے بانی (میرزا غلام احمد صاحب) نے انگریزوں کی اطاعت کو مذہبی فریضہ قرار دیا تھا۔ قرآن مجید میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ..... (۴/۵۹)" یعنی، تم خدا کی اطاعت کرو۔ رسول کی اطاعت کرو۔ اور تم میں سے جنہیں کچھ اختیارات سونپ دیئے جائیں، ان کی اطاعت کرو۔" میرزا صاحب نے اس آیت کی تشریح میں لکھا تھا۔

> اولی الامر سے مراد جسمانی طور پر بادشاہ اور روحانی طور پر امام الزماں ہے جسمانی طور پر جو شخص ہمارے مقاصد کا مخالف نہ ہو اور اس سے مذہبی فائدہ ہمیں حاصل ہو سکے وہ ہم میں سے ہے۔ اس لئے میری نصیحت اپنی جماعت کو یہی ہے کہ وہ انگریزوں کی بادشاہت کو اپنے اولی الامر میں داخل کریں اور دل کی سچائی سے ان کے مطیع رہیں۔
>
> (ضرورت الامام - صفحہ ۲۳)

انہوں نے اپنے اشتہار مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۸۹۴ء میں لکھا تھا کہ

> میں سولہ برس سے برابر اپنی تالیفات میں اس بات پر زور دے رہا ہوں کہ مسلمانانِ ہند پر اطاعت گورنمنٹ برطانیہ کی فرض اور جہاد حرام ہے۔ (تبلیغ رسالت جلد سوم ص۱۹۶)

میرزا صاحب کی اس قسم کی تحریریں بکثرت پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن میں انہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ سب تفصیلات میری کتاب "ختم نبوت اور تحریک احمدیت" میں مل سکیں گی۔

(۲) مسلمان اس واقعہ کو کیسے بھول سکتے ہیں کہ سر ظفر اللہ خان نے قائداعظمؒ کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی تھی، درآں حالیکہ وہ لاکھوں مسلمانوں کے مجمع میں، قائداعظمؒ کی میت کے قریب کھڑے تھے*۔

---

* سر ظفر اللہ خان کی اس جرأت کی داد نہ دینا خلاف انصاف ہوگا کہ انہوں نے ایسے نازک وقت میں بھی اپنے عقیدہ کے اظہار میں کسی مداہنت یا دو رخی سے کام نہیں لیا تھا۔

(۳) سر ظفر اللہ خان جس جماعت (جماعتِ احمدیہ) سے متعلق ہیں، اس نے پاکستان کو کبھی نہیں اپنایا۔ اس جماعت کے امیر، میرزا بشیر الدین محمود (خلیفۂ ثانی) نے تحریکِ پاکستان کے دوران، ایک سوال کے جواب میں (کہ اب جبکہ پوری مسلمان قوم نے پاکستان کے مطالبہ کو اپنا لیا ہے، آپ کا اس کے متعلق کیا خیال ہے) کہا تھا کہ

بے شک مسلمان نعرے لگاتے رہیں۔ جس مادی قسم کا پاکستان وہ چاہتے ہیں، وہ کبھی نہیں بن سکتا۔

(روزنامہ الفضل ۸ جون ۱۹۴۴ء۔ بحوالہ پیغام صلح مورخہ ۲۹ مارچ ۸۳ء)

یعنی "روحانی پاکستان" تو ان کے نزدیک، قادیان میں بن چکا تھا۔ جس قسم کا پاکستان مسلمان چاہتے تھے وہ کبھی نہیں بن سکے گا۔

جب پاکستان کا مطالبہ منظور ہو گیا تو ان سے پوچھا گیا کہ اب وہ کیا کہتے ہیں تو انہوں نے کہا:۔

ہندوستان کی تقسیم پر ہم راضی ہوئے ہیں تو خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری سے۔ اور پھر کوشش کریں گے کہ کسی نہ کسی طرح جلد متحد ہو جائیں۔

(الفضل ۱۶ مئی ۱۹۴۷ء۔ بحوالہ پیغام صلح مذکور)

پاکستان کی سکیم کو ان حضرات کی طرف منسوب کرنے سے جس قسم کے تاثرات پیدا ہو سکتے ہیں، ظاہر ہے۔ اس باب میں خان ولی خان کی "سادگی و پرکاری" کی داد نہ دینا خلافِ انصاف ہو گا۔

(۰)

خان ولی خان کے اس بیان (اور بعد کی تشریحات) پر ملک میں کافی لے دے ہوئی لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اس بحث میں بالعموم جذبات سے کام لیا گیا، حقائق کو پیش نہیں کیا گیا۔ خان صاحب نے جو کچھ کہا ہے، وہ انہیں سے مختص نہیں۔ اصل یہ ہے کہ جو لوگ اسلام (الدین) کی کنہ و حقیقت سے واقف نہیں، (وہ خواہ سیکولر لیڈر ہوں اور خواہ مذہب پرست علماء) مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ ان کی سمجھ میں آ نہیں سکتا یا وہ سمجھنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ قیامِ پاکستان کے بعد اب تک اس سلسلہ میں بڑے بڑے دانشورانِ قوم کی طرف سے جو کچھ کہا گیا ہے، وہ پاکستان کے جذبۂ محرکہ سے ناواقفیت کا غماز ہے۔ متفقہ طور پر یہ کہا جاتا رہا کہ یہ ہندو کی تنگ نظری اور تعصب تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں نے تنگ آ کر علیحدگی کا فیصلہ کیا۔ بعض نے کہا کہ اس مطالبہ کی پشت پر معاشی مفادات کا جذبہ کارفرما تھا۔ بعض نے اسے قائد اعظمؒ کی انانیت کا مظاہرہ قرار دیا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ خان ولی خان صاحب کے الزام کے جواب میں بھی ایسا کچھ ہی کہا گیا ہے۔ میں اس باب میں جذبات سے کام نہیں لوں گا۔ حقائق اور شواہد کی رُو سے واضح کرنے کی کوشش کروں گا کہ

(۱) مطالبہ اور قیامِ پاکستان کا حقیقی جذبۂ محرکہ، اور مقصود و منتہیٰ کیا تھا؟

(۲) کیا یہ خیال ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے بعد کا آورد تھا؟

(۳) کیا یہ انگریز کی پسندیدہ سکیم تھی؟

(۴) کیا قائدِ اعظمؒ انگریز کے آلۂ کار تھے۔

میں ان حقائق کو تشکیلِ پاکستان سے پہلے بھی پیش کرتا رہا تھا، اور اس کے بعد بھی پیش کرتا چلا آ رہا ہوں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ بحث کے تناظر میں ان کا بیک وقت سامنے آ جانا، فائدہ سے خالی نہیں ہوگا۔

——(۰)——

پہلا پاکستان

مطالبۂ پاکستان کے سلسلہ میں جو شکوک یہاں ابھارے گئے اور ابھارے جا رہے ہیں، اسی قسم کے شکوک "پہلے پاکستان" کے سلسلہ میں بھی پیدا کئے جاتے ہیں۔ "پہلے پاکستان" کے الفاظ آپ کو انوکھے سے لگیں گے۔ لیکن میں نے یہ الفاظ ان کے حقیقی معانی میں استعمال کئے ہیں۔ یعنی "پاکیزہ سیرت حضرات کا مسکن جس میں قرآن کی حکمرانی ہو"۔ یہ حقیقی پاکستان آج سے چودہ سو سال پہلے حجاز کی ارضِ پاک میں متشکل ہوا تھا۔ غیر مسلم مؤرخین، خواہ وہ سیکولر ذہنیت کے حامل ہوں اور خواہ کسی مذہب کے پیرو، اس کے جذبۂ محرکہ کا صحیح اندازہ کر نہیں سکتے۔ چنانچہ وہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ جب تک مکہ میں رہے، ان کی حیثیت ایک مصلح یا مبلغ کی تھی۔ مدینہ جا کر جب کچھ قوت مجتمع ہوتی نظر آئی تو آپؐ کے دل میں مملکت سازی کا خیال پیدا ہوا۔ ان لوگوں کا یہ خیال، نہ صرف یہ کہ دین کی حقیقت سے عدمِ واقفیت کی دلیل ہے، خود تاریخی حقائق کے بھی خلاف ہے۔ تاریخ الکامل (ابن اثیر) میں ہے کہ.... رسول اللہؐ نے اپنی دعوت کے آغاز میں، جو پیغامات خود اپنے اہلِ خاندان کے نام بھیجے تھے، ان میں کہا تھا کہ

> یاد رکھو! تمہاری قوم میں آج تک کوئی ایسا جوان پیدا نہیں ہوا جس نے تمہارے سامنے اس نصب العین سے بہتر نصب العین رکھا ہو جسے میں پیش کر رہا ہوں۔ میں تمہارے پاس دنیا اور آخرت دونوں کی بہتری کے لئے آیا ہوں۔ خدا کی بالادست حکومت کی طرف سے مجھے ہدایت ملی ہے کہ میں تمہیں اس کی طرف دعوت دوں۔ مجھے اس (حکومت) کے امور سرانجام دینے کے لئے وزراء کی ضرورت ہوگی۔ کون ہے جو میرے ساتھ وزیر کی حیثیت سے کام کرے؟

اس کے بعد حضورؐ نے اپنی دعوت کے تیسرے سال ان لوگوں کو "حکومتِ خداوندی" کے لئے جمع ہونے کی دعوت دی اور فرمایا کہ "یاد رکھو! یا تو خدا کا حکم غالب ہوگا اور یا میں اپنی جان سے گذر جاؤں گا"۔ اسی "تاریخ (الکامل)" میں مذکور ایک اور واقعہ بھی قابلِ غور ہے۔ ایک دفعہ قبیلۂ عامر کا ایک معزز اور بزرگ سردار آپؐ کے حلقۂ دعوت میں پہنچا اور اس کے متعلق بہت سے سوالات کئے۔ اسی سلسلہ میں اس نے کہا کہ لکل قول حقیقۃ وما حقیقۃ قولک۔ ہر دعوٰی کا کوئی ٹھوس ثبوت ہوتا ہے۔ آپؐ کے دعوٰی کی صداقت کا ٹھوس ثبوت کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں اپنے باپ ابراہیمؑ اور اپنے بھائی عیسٰےؑ کی ذمہ داریوں، بشارتوں اور عظمت و اقتدار کا حامل ہوں۔ عامری نے کہا کہ اگر میں ان ذمہ داریوں کو پورا کر دوں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ جنت کے باغات۔ اس نے کہا کہ یہ تو آخرت کی بات ہے۔

میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے مجھے اس دنیا میں کیا حاصل ہوگا۔ آپؐ نے فرمایا کہ

نِعْمَ النَّصْرُ وَالتَّمْكِيْنُ فِي الْبِلَادِ

خوش آئند فتوحات اور ملکوں پر حکومت۔ (شاہکارِ رسالت ص۱۴۷)

اور یہ محض قیاس آرائی نہیں تھی۔ خدا کے اس وعدہ پر یقینِ محکم کا لازمی نتیجہ تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ "ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہے" (۲۴/۵۵) یہی وہ یقینِ محکم تھا جس کی بنا پر حضورؐ کبھی اعلان فرماتے تھے کہ "زمین کے مشرق و مغرب کے علاقے میرے ہاتھ میں...... دیئے گئے ہیں" کبھی اپنے رفقاء (صحابہؓ) سے فرماتے کہ "قیصر و کسریٰ کی شاہنشاہیوں کا خاتمہ ہو جائے گا" اور یہ سب اس لئے کہ دین کا تمکن، اپنی آزاد مملکت کے بغیر ممکن نہ تھا۔ (۲۴/۵۵) لہٰذا، یہ خیال غلط ہے کہ مکّی دور میں تو آپؐ کی زندگی محض ایک مصلح کی سی تھی۔ قیامِ مملکت کا خیال مدنی زندگی میں جا کر پیدا ہوا۔ حضورؐ کی زندگی کا مقصد دین کا تمکین تھا اور دین کا تمکن اپنی آزاد مملکت کے بغیر ناممکن تھا۔ لہٰذا جب آپؐ نے دین کی دعوت کی ابتدا ہی کی تو مملکت کا تصوّر اس کے ساتھ شامل تھا۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جو نہ سیکولرسٹوں کی سمجھ میں آسکتی ہے (کیونکہ ان کے نزدیک، مملکت کو مذہب کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہوتا) اور نہ ہی مذہب پرستوں کی سمجھ میں (کہ ان کے نزدیک بھی مذہب کو مملکت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو سکتا) چنانچہ پہلا پاکستان دین کے تمکّن کے لئے وجود میں لایا گیا تھا۔

صدرِ اوّل کے بعد، خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہو گئی اور دین، مذہب بن کر رہ گیا۔ پھر مملکت کو دین سے کوئی تعلق نہ رہا۔ یاد رکھئے! جو حکومت قائم ہی غیر قرآنی طریق سے ہو، اس میں دین بار نہیں پا سکتا۔ وہ حکومت سیکولر ہوتی ہے خواہ حکمران مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ صورتِ حالات صدیوں سے برابر چلی آ رہی تھی کہ ہمارے

اقبالؒ کا پیش کردہ تصوّر

دور میں ایک قرآنی مفکّر (اقبالؒ) نے اس فراموش کردہ حقیقت کی یاد دہانی کرائی کہ ہم جس اسلام کے پیرو چلے آ رہے ہیں، وہ دین نہیں مذہب ہے۔ دین کا قیام صرف اُس آزاد مملکت میں ممکن ہے جس میں قرآن کی حکمرانی ہو۔ شدہ شدہ تو وہ اس حقیقت کو ایک عرصہ سے پیش کرتے چلے آ رہے تھے لیکن اسے ایک متعین سکیم کی شکل میں، انہوں نے سنہ ۱۹۳۰ء کے الٰہ آباد کے خطبہ میں پیش کیا۔ وہ خطبہ ہماری ملّی زندگی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے گہرے فکر و تدبّر کا محتاج۔ اس مقام پر میں اس کے چند ایک اقتباسات پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ انہوں نے اپنے خطبہ کا آغاز ان الفاظ سے کیا:-

> آپ حضرات نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لئے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو عقیدہ رکھتا ہے، اور اپنے اس عقیدہ میں مایوسی کا کوئی شائبہ نہیں پاتا، کہ اسلام ایک زندہ اور پائندہ قوّت ہے جو انسانی نگاہ کو جغرافیائی حدود و قیود کے قفس سے آزاد کر کے اسے اس کی فطری وسعتوں میں اذنِ بال کشائی دے گا۔ جس کا عقیدہ یہ ہے کہ دین، انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک اہم ترین قوّت کا حامل ہے اور جسے اس کا محکم یقین ہے کہ اسلام خود

تقدیرِ الٰہی ہے۔ زمانہ کی تقدیریں اس کے ہاتھ میں رہیں گی، اور اس کی تقدیر کسی کے ہاتھ میں نہیں ہوگی۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ تمام مسائل کو اپنے خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھے۔ یہ ہرگز نہ خیال فرمائیے کہ جس مسئلہ کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ کوئی نظری مسئلہ ہے نہیں۔ یہ تو ایک زندہ اور عملی مسئلہ ہے جو خود نفسِ اسلام پر بحیثیت ایک نظامِ حیات کے عمل کے اثر انداز ہوگا۔ اس مسئلہ کے صحیح اور مناسب حل پر ہی اس امر کا انحصار ہے کہ آپ حضرات ہندوستان میں ایک ممتاز تہذیب کے علمبرداروں کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں گے۔

اس تمہید کے بعد انہوں نے، "مذہب اور دین" کے فرق کو ان الفاظ میں نمایاں کیا۔ فرمایا:-

حقیقت یہ ہے کہ اسلام، خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ کا نام نہیں یہ ایک نظامِ حکومت ہے جس کی ہیئتِ ترکیبی میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ وہ ہر عملِ غیر کو اپنے اندر جذب کرے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روسو کے دماغ میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا۔ اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے جس کی رو سے انسان جمادات اور نباتات کی طرح بالکل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اس خطۂ زمین سے منسوب کر دیا اور کبھی اس سے۔ بلکہ وہ ایک ایسی روحانی ہستی سمجھا جاتا ہے جس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فِٹ ہو۔ وہ ایک فعال مشینری کا پرزہ ہوتا ہے اور اسے ٹھیک انداز میں چلانے کے لئے اس پر حقوق و فرائض کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

اس نظری بحث کے بعد وہ اس عملی سوال کی طرف آئے جس کے لئے یہ تمہید اٹھائی گئی تھی۔ اس ضمن میں انہوں نے کہا:-

ہندوستان دنیا بھر میں بہت بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ مسلمانانِ ہند کے اس زندہ اور جاندار طبقہ میں، کہ جس کے بل بوتے پہ یہاں برطانیہ کی حکومت قائم ہے، (باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ برتاؤ نہیں کیا) اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ آخر الامر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھا دے گا۔

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا:-

تنہا ایک ملک میں سات کروڑ فرزندانِ توحید کی جماعت کوئی معمولی چیز نہیں۔ تمام مسلم ایشیا

۱؎ سنہ ۱۹۳۰ء میں ہندوستان میں مسلمانوں کی اتنی ہی تعداد تھی۔

کے ممالک مجموعی طور پر بھی اسلام کے لئے اتنی گراں بہا متاع نہیں جتنی اکیلے ہندوستان کی ملتِ اسلامیہ۔ اس لئے ہمیں ہندوستان کے مسئلہ کو صرف اس نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیئے کہ ہندوستان میں اسلام کا کیا حشر ہوگا بلکہ اپنی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس نقطۂ خیال سے بھی کہ ہماری موت اور حیات کا عالمِ اسلام پر کیا اثر ہوگا۔

اُن کی بصیرت نے یہاں تک کہہ دیا کہ

مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں ہندوستان میں شاید ایسے خطرناک حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمانوں کو اپنا جداگانہ محاذ قائم کر کے ان کا مقابلہ کرنا پڑے۔

اُس وقت کے حالات کے مطابق اس مسئلہ کا انہوں نے عملی حل یہ بتایا کہ

پاکستان کا ہیولیٰ | میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے ...... مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔

اس مملکت کے قیام سے ہوگا کیا؟ فرمایا کہ

اس سے اسلام کو اس امر کا موقعہ ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی ملوکیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کی صحیح معنوں میں تجدید ہو سکے گی، بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔

اسی حقیقت کو انہوں نے اس سے بھی دو برس پہلے اپنے خطباتِ تشکیلِ جدید (کے چھٹے خطبہ) میں سعید حلیم پاشا (مرحوم) کی ہمنوائی میں، ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ

اندریں حالات ہمارے لئے کشادِ کار کی ایک ہی راہ ہے۔ اور وہ یہ کہ آئینۂ اسلام پر غیر اسلامی رنگ کی جو سخت اور درشت تہیں جم گئی ہیں، اور جس کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامد ہو کر رہ گیا ہے، انہیں کھرچ کھرچ کر الگ کیا جائے، اور حریت، سالمیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو از سرِ نو زندہ کر کے، ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی، عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیلِ جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی، اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ اقبالؒ کی یہ دعوت کیا تھی؟ ایک ایسی مملکت کا قیام جس میں دین ایک زندہ حقیقت کی صورت میں نفاذ پذیر ہو سکے! یہ اسی دعوتِ ربّانی کی صدائے بازگشت تھی جو "پہلے اور حقیقی پاکستان" کے قیام کے سلسلہ میں بلند ہوئی تھی۔ اس میں قدمِ اوّل اس "مذہب" سے پیچھا چھڑانا تھا، جس نے دین کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ اقبالؒ کے کلام میں، مُلّا، فقیہہ اور صوفی کے خلاف جو کچھ کہا گیا

ہے (اور بہ تکرار و اصرار کہا گیا ہے) اس کا مقصد یہی ہے۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس (منعقدہ ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء) کے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا۔

> تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند فطری، ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔

یہ تھا مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ جو نہ کسی مذہب پرست (سر) ظفر اللہ خان کے تصور میں آ سکتا تھا، نہ سیکولرازم کے حامی، کسی ولی خان کی سمجھ میں۔ یہ اسی کی سمجھ میں آ سکتا تھا جو اس حقیقت پر یقین رکھتا ہو کہ ایک آزاد مملکت کا قیام جس میں قرآن کی حکمرانی ہو، خود اسلام کا تقاضا ہے۔ اس کے بغیر مسلمان، اسلام کے مطابق زندگی بسر ہی نہیں کر سکتے۔

(۰)

جناحؒ کی ہمنوائی

محمد علی جناح (قائدِ اعظمؒ) اس زمانے میں ہنوز نیشنلسٹ تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست داعی لیکن وہ اپنی کوششوں میں ناکام ہو کر، ایک شکست خوردہ سپاہی کی طرح، انگلستان کے گوشۂ تنہائی میں جاگزیں ہو چکے تھے۔ اقبالؒ کی نگاہ دوررس نے بھانپ لیا تھا کہ ان کے اس تصور کو عملی پیکر عطا کرنے کے لئے یہی (اور صرف یہی) مردِ میداں موزوں ہو سکتا ہے۔ انہوں نے "نیشنلسٹ جناح" کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ حتمی طور پر کہا نہیں جا سکتا کہ اس سلسلہ کا آغاز کب سے ہوا۔ ان کے سوانح نگار (HECTOR -- BOLITHO --) نے اپنی کتاب (JINNAH) میں لکھا ہے کہ

> مسٹر جناح نے لندن میں، سر محمد اقبالؒ سے بہت سی ملاقاتیں کیں۔ وہ بڑے اچھے دوست تھے۔ مسٹر جناح اگرچہ (اپنے سابقہ سیاسی مسلک کے متعلق) اب کسی غلط فہمی میں نہیں تھے۔ بایں ہمہ وہ اقبالؒ کے دلائل سے (اتنی جلدی) متفق نہیں ہوئے۔ اس میں قریب دس سال[1] کا عرصہ لگ گیا کہ مسٹر جناحؒ نے اس کا اعتراف کیا کہ ہندوستان کی سیاست کے گہرے مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ اقبالؒ کا نقطۂ نظر صحیح ہے۔ (ص ۹)

اس کے بعد جب مسٹر جناحؒ واپس وطن آئے تو اس مصنف نے اس وقت کی کیفیت کا نقشہ ان الفاظ

[1] مصنف کو اس میں کچھ تسامح ہو گیا ہے۔ ان کے خیالات میں ہم آہنگی بہت پہلے ہو گئی تھی۔

میں کھینچا ہے:۔

مسٹر جناح اپنے بمبئی کے مکان میں بالکل تنہا تھے۔ ان کے پاس کوئی ذاتی سٹاف نہیں تھا حتیٰ کہ سیکرٹری بھی نہیں جو ان کے خطوط کی نقلیں رکھ سکتا اور ان کے کاغذات کو باقاعدہ فائل کئے جاتا۔ اس بے قاعدگی کے باوجود ان کے دراز میں خطوط کا ایک ایسا بنڈل تھا جس سے وہ تسکین خاطر حاصل کیا کرتے تھے۔ یہ وہ خطوط تھے جو (اقبالؒ نے) انہیں انگلستان میں سنہ ۱۹۳۲ء میں کی گئی ملاقات کے بعد لکھے تھے ...... (صفحہ ۱۴)

ان خطوط کے تذکرہ کے درمیان ایک ضمنی واقعہ ... علامہ اقبالؒ جب گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں لندن تشریف لے گئے ہیں، تو چوہدری رحمت علی (مرحوم) نے (جو اس زمانے میں وہاں طالب علمی کی زندگی بسر کر رہے تھے) حضرت علامہؒ کے تصور کی اسلامی مملکت کا خاصا چرچا کر رکھا تھا۔ عام طور پہ مشہور ہے کہ لفظ "پاکستان" بھی انہی کا وضع کردہ ہے۔ لیکن، مسٹر عبدالوحید خان نے، اپنی کتاب (INDIA WINS FREEDOM _ THE OTHER SIDE) میں لکھا ہے کہ یہ نام، درحقیقت، علامہ اقبالؒ کا تجویز فرمودہ تھا۔ (صفحہ ۱۲) مجھے اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تو

اقبالؒ کے خطوط

صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء میں، علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ تصورِ پاکستان کا چرچا عام ہو گیا تھا۔ انہوں نے ۲۱ جون سنہ ۱۹۳۷ء کو، قائدِ اعظمؒ کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ

انگلستان سے واپسی سے پہلے، لارڈ لوتھین نے مجھ سے کہا تھا کہ ہندوستان کے مصائب کا حل صرف تمہاری سکیم کی رُو سے ہو سکتا ہے لیکن اسے بروئے کار آنے میں شاید پچیس سال کا عرصہ لگ جائے۔ (جناح کے نام خطوط ۔ صفحہ ۲۱)

ہیکٹر بولیتھو نے جن خطوط کا ذکر کیا ہے، ان میں سے بعض خطوط، خود قائدِ اعظمؒ کے تعارف کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔ علامہ اقبالؒ ۲۸ مئی سنہ ۱۹۳۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

اسلامی قانون کے ایک عرصۂ دراز کے مطالعہ کے بعد، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس قانون کو اچھی طرح سمجھ کر اسے نافذ کر دیا جائے، تو کم از کم ہر فردِ معاشرہ کو رزق کی ضمانت تو مل جائے گی۔

لیکن مسلمانوں کی ایک یا ایک سے زیادہ آزاد مملکتوں کے بغیر اسلامی شریعت کا نفاذ اور ارتقا ناممکن ہے ...... اس مقصد کے لئے ملک کی تقسیم اور اکثریتی علاقوں میں آزاد مسلم مملکت یا مملکتوں کا قیام ناگزیر ہے۔ (صفحہ ۱۸ - ۱۶)

قائدِ اعظمؒ نے ان خطوط کا بڑا تفصیلی تعارف لکھا ہے جس میں مسئلہ تقسیم ہند پہ کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:۔

...... ان خطوط کی تاریخی اہمیت بڑی زیادہ ہے۔ بالخصوص وہ خطوط جن میں اقبالؒ

نے واضح اور غیر مبہم طور پر مسلم ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے سلسلہ میں اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ ان کے خیالات مجموعی طور پر میرے خیالات سے ہم آہنگ تھے اور ہندوستان کو جو آئینی مسائل درپیش تھے ان کے گہرے مطالعہ اور غور و خوض کے بعد آخراً میں بھی انہی نتائج تک پہنچا جو سر اقبالؒ کے تھے۔ یہی تصورات تھے جو اپنے وقت پر آکر مسلمانانِ ہند کے متفقہ عزم کی شکل میں نمودار ہوئے اور لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کی اُس قرارداد کی صورت اختیار کر گئے جسے عام طور پر قراردادِ پاکستان کہا جاتا ہے اور جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو منظور کی گئی تھی۔ (صفحہ ۵ - ۴)

آپ نے غور فرمایا کہ تقسیم ہند کی جس سکیم کو خان ولی خان صاحب، سر ظفر اللہ خان کے ذہن کی تراشیدہ اور لارڈ لنلتھگو کی پسندیدہ قرار دیتے ہیں، اس کا سرچشمہ کیا تھا! اور وہ کن مراحل کو طے کرکے ۱۹۴۰ء کے لیگ کے سیشن تک پہنچی تھی؟

ابھی تک یہی سمجھا جاتا تھا کہ علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کے خیالات میں ہم آہنگی کی ابتدا ۳۲-۱۹۳۱ء سے ہوئی تھی۔ لیکن (لاہور کے) روزنامہ جنگ، بابت ۱۰ فروری ۱۹۸۲ء میں شائع شدہ حسب ذیل خبر اس سلسلہ کو اور بھی پیچھے لے جاتی ہے۔ لکھا ہے:

تحریکِ پاکستان کے بارے میں جدید تحقیق کے نتیجہ میں یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ قائدِ اعظم اور حکیم الامت کے درمیان ۱۹۲۹ء ہی سے اس بارے میں ہم آہنگی موجود تھی کہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی مشکلات کا واحد حل ان کے علیحدہ وطن کے قیام میں مضمر ہے۔ اس موافقت اور ہم آہنگی کا اظہار ۱۹۳۰ء میں ہوا جب علامہ اقبالؒ نے الہ آباد کے مقام پر اپنا معروف خطبہ پیش کیا۔ یہ شہادت ان دستاویزات کی روشنی میں سامنے آتی ہے جو پاکستان کے معروف قانون دان شریف الدین پیرزادہ نے لندن کی انڈیا آفس لائبریری سے حاصل کی ہیں.......

جیسا کہ میں اس المیہ کو متعدد بار دہرا چکا ہوں، ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ نہ تحریکِ پاکستان کی کوئی مستند تاریخ ابھی تک شائع ہوئی ہے اور نہ ہی قائدِ اعظمؒ کی کوئی قابلِ اعتماد سوانح حیات — ان موضوعات کے متعلق تحقیق ہو تو معلوم کس کس قسم کے نادر کوائف منصۂ شہود پر آئیں۔

اس مقام پر ایک لمحہ کے لئے رکئے اور ایک ایسی درخشندہ حقیقت کو سامنے لائیے جس سے آپ کی نگاہوں میں چمک پیدا ہو جائے گی — ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان ہر دو زعمائے ملت (علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ) میں فکر و نظر کی کس قدر ہم آہنگی اور مقاصدِ زندگی میں کس قدر یک رنگی پیدا ہو چکی تھی۔ جہاں تک عظمتِ مقام کا تعلق ہے دونوں میں کچھ فرق نہیں کیا جا سکتا۔ بایں ہمہ، ان کے باہمی تعلقات کس قسم کے تھے اس کا سمجھ لینا ضروری ہے کیونکہ اس تحریک کو جو محیر العقول کامیابی ہوئی اس میں اس عنصر کا بہت بڑا حصہ ہے۔

جنوری ۱۹۳۸ء کا ذکر ہے کہ پنڈت جواہر لعل نہرو، حضرت علامہؒ سے ملنے کے لیے آئے۔ ان کے ساتھ میاں افتخار الدین مرحوم بھی تھے۔ دورانِ گفتگو میاں صاحب نے علامہؒ سے کہا کہ "ڈاکٹر صاحب! آپ مسلمانوں کے لیڈر کیوں نہیں بن جاتے۔ مسلمان، مسٹر جناحؒ سے زیادہ آپ کی عزت کرتے ہیں"۔ علامہؒ صاحب لیٹے ہوئے تھے۔ یہ سنتے ہی غصے میں آگئے۔ اٹھ کر بیٹھ گئے اور انگریزی میں کہنے لگے۔

"اچھا! تو چال یہ ہے کہ آپ مجھے بہلا پھسلا کر مسٹر جناحؒ کے مقابلہ پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسٹر جناحؒ ہی مسلمانوں کے اصلی لیڈر ہیں۔ میں تو ان کا ایک معمولی سپاہی ہوں۔ (اقبالؒ کے آخری دو سال" ص۵۳۲۔ عاشق حسین بٹالوی)۔

یہ تو رہا علامہؒ کی نظروں میں قائدِ اعظمؒ کا احترام۔ دوسری طرف قائدِ اعظمؒ کو لیجئے۔ انہوں نے ۲ مارچ ۱۹۴۱ء کو یوم اقبالؒ کی ایک تقریب پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

> مرحوم دورِ حاضر میں اسلام کی تاریخ تھے۔ اس زمانے میں اقبالؒ سے بہتر اسلام کسی اور شخص نے نہیں سمجھا۔ مجھے اس کا فخر ہے کہ میں نے ان کی قیادت میں بحیثیت ایک سپاہی کے کام کیا ہے۔ (ہفتہ وار حمایت اسلام۔ ۴ مارچ ۱۹۴۱ء)

یہ ہوتی ہیں عظیم انسانوں کی علامات! یہ دونوں فی الواقعہ عظیم انسان تھے۔ اس کی روشنی میں ذرا دورِ حاضر کے لیڈروں پر نگاہ ڈالئے اور آنکھیں جھکا کر رہ جائیے!

(٥)

بہرحال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ تقسیم ہند کی سکیم علامہ اقبالؒ کے تصور کی تخلیق تھی جسے قائدِ اعظمؒ نے ۱۹۴۰ء میں پیش کیا تھا۔ نیشنلسٹ محمد علی جناحؒ کے مسلک میں اس قدر انقلاب ہی کچھ کم تحیر انگیز نہیں لیکن حقیقی اور (بظاہر) ناقابلِ یقین انقلاب وہ ہے جو مسلمانوں کی حکومت اور اسلامی حکومت کی تفریق و تخصیص کے متعلق ان کی نگاہ میں پیدا ہوا۔ یہ وہ انقلاب تھا جس کا اظہار جستہ جستہ تو مختلف مقامات پر ہوتا رہا، لیکن جامع طور پر، اس انٹرویو میں ہوا جو انہوں نے ۱۹۴۱ء میں عثمانیہ یونیورسٹی (حیدر آباد۔ دکن) کے طلباء کو دیا تھا۔

حیدر آباد کا انٹرویو

میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح علامہ اقبالؒ کا ۱۹۳۰ء کا خطبۂ صدارت اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں اسلامی مملکت کی غرض و غایت کو نمایاں طور پر سامنے لایا گیا ہے، اسی طرح قائدِ اعظمؒ کا ۱۹۴۱ء کا انٹرویو، اس حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے کہ انہوں نے اسلام کو کس طرح صحیح طور پر سمجھا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

اس انٹرویو میں ان طلباء نے پہلا سوال یہ کیا کہ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں۔ اس کے جواب میں قائدِ اعظمؒ نے فرمایا:۔

> جب میں انگریزی میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور قوم کے محاورہ کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں

بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں، نہ ملّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریقِ کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے، اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔

سوال:۔ اس سلسلہ میں اشتراکی حکومت وغیرہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:۔ اشتراکیت، بالشویت یا دیگر اسی قسم کے سیاسی اور معاشی مسلک دراصل اسلام اور اس کے نظامِ سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا ربط اور تناسب و توازن نہیں پایا جاتا۔

اس کے بعد ان طلباء نے یہ سوال کیا کہ ترکی حکومت ایک مادی حکومت (سیکولر اسٹیٹ) ہے۔ کیا اس سے اسلامی حکومت مختلف ہے؟ سوال آپ نے سن لیا۔ اب قائدِ اعظمؒ کا جواب سنیئے اور غور کیجئے کہ کیا اس قدر جامع اور مانع الفاظ میں اسلامی حکومت کا صحیح تصور کہیں اور بھی ملتا ہے؟ فرمایا:۔

میرے خیال میں ترکی حکومت پر مادی حکومت کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی۔ اب رہا اسلامی حکومت کے تصور کا امتیاز، سو یہ بالکل واضح ہے۔ اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد ان طلبا نے سوال کیا کہ وہ مملکت ہمیں ہندوستان میں کس طرح مل سکتی ہے؟ اس کے جواب میں آپ نے کہا کہ مسلم لیگ۔ اس کی تنظیم اور اس کی جدّ و جہد اس کا رُخ، اس کی راہ، سب اس سوال کے جواب ہیں۔ اس جواب کے مختصر الفاظ میں تحریکِ پاکستان کی پوری غرض و غایت اور مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ سمٹ کر سامنے آجاتا ہے۔ اس کے بعد طلباء نے ایک دلچسپ سوال کر ڈالا۔ لیکن قائدِ اعظمؒ نے اس کے جواب میں جو کچھ فرمایا اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ علامہ اقبالؒ کی ہم نوائی میں وہ بھی اس سے متفق تھے کہ ؎

میں جانتا ہوں انجام اس کا   جس معرکے کے ملّا ہوں غازی

آپ، وہ سوال اور اس کا جواب ملاحظہ فرمایئے:۔

سوال:- جب آپ اسلامی اصول کے نصب العین اور طریق کار دونوں میں بہترین حکومت کا یقین رکھتے ہیں اور اجمالاً یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو خود مختار علاقے اس لئے مطلوب ہیں کہ وہ وہاں اپنے ذہنی میلانات اور تصورات زندگی کو بلا روک ٹوک بروئے کار اور روبہ ترقی لا سکیں، تو پھر اس میں کونسا امر مانع ہے کہ مسلم لیگ زیادہ تفصیل اور توضیح کے ساتھ اپنی جدوجہد کی مذہبی تعبیر و تشریح کر دے؟

جواب:- دقت یہ ہے کہ جب اس جدوجہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت، بغیر اس بات کے سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت، تقسیم عمل اور اس کے اصلی حدود کیا ہیں، ان امور کو صرف چند مولویوں کا اجارہ خیال کر لیتی ہے، اور اپنے حلقہ سے باہر اہلیت و استعداد کے باوجود مجھ میں یا آپ میں، (یعنی ان کے اپنے سوا کسی اور میں) اس خدمت کے سر انجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی۔ حالانکہ اس منصب کی بجا آوری کے لئے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے، انہیں میں ان مولوی صاحبان میں (الا ماشاء اللہ) نہیں پاتا۔ (اور مشکل اندر مشکل یہ کہ) وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔

یہی وجہ ہے جو تشکیل پاکستان کے بعد قائد اعظمؒ نے ساری دنیا سے برملا کہہ دیا تھا کہ مملکت پاکستان میں تھیاکریسی نہیں ہوگی۔ اس سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ نہ صرف یہ کہ یہ سکیم کسی قادیانی کی تخلیق اور انگریز کا خود کاشتہ پودا" نہیں تھی بلکہ یہ بھی کہ یہ کوئی (آجکل کی اصطلاح میں) خالصتہً سیاسی تحریک بھی نہیں تھی۔ یہ دین کا تقاضا تھا جسے پورا کرنے کے لئے اقبالؒ اور جناحؒ سرگرم عمل تھے۔ اسی لئے قائد اعظمؒ ملت اسلامیہ ہندیہ کو بار بار متنبہ کرتے تھے کہ

> اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس ملک سے اسلام کا نام و نشان مٹ جائے تو اس کے لئے پاکستان نہ صرف یہ کہ ایک عملی نصب العین ہے بلکہ یہی اور صرف یہی واحد نصب العین ہے۔
>
> (دس مارچ ۱۹۴۱ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبا سے خطاب۔ تقاریر جلد اول صفحہ ۲۶۷)

اور یہ کہ

> اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو نہ صرف یہ کہ ہم تباہ ہو جائیں گے بلکہ اس برصغیر میں مسلمانوں کا اور اسلام کا نام و نشان تک باقی نہیں رہے گا۔ (۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء کو پاکستان ڈے کی تقریب پر پیغام۔ تقاریر جلد دوم۔ صفحہ ۲۵۵)

(۰)

خان ولی خان صاحب نے اپنے انٹرویو میں تو یہ بات مجملاً کہی تھی کہ مسلم لیگ کی سنہ ۱۹۴۰ء کی سکیم انگریز کی ہدایت کے مطابق سر ظفر اللہ خان نے تیار کی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے ایک خط میں اسے متعین طور پر لکھ دیا۔ (خط کا پورا متن ہم ذرا آگے چل کر نقل کریں گے) اس میں انہوں نے کہا:-

> اس سے قبل زبانی طور پر تو ایک علیحدہ مسلم ریاستی باتیں کی جا رہی تھیں لیکن کوئی تحریری دستاویز موجود نہ تھی اس لئے وائسرائے کی ہدایت کے مطابق مسٹر ظفر اللہ خان نے ایک

تجویز تیار کی جسے قرارداد کی شکل میں منظور کر لیا گیا۔

(چٹان - بابت یکم تا ۸ فروری ۱۹۸۲ء)

خان صاحب کو اگر واقعی تلاش ہوتی تو انہیں اس قسم کی دستاویز بھی مل جاتی۔ لیکن جب مقصد کیچڑ اچھالنا ہو تو پھر ہاتھوں میں پکڑی ہوئی دستاویزات بھی زیر آستین چلی جاتی ہیں۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں

سندھ پراونشل مسلم لیگ کی قرارداد

سندھ پراونشل مسلم لیگ کا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا جس کی صدارت خود، قائداعظمؒ نے کی۔ اس اجلاس میں حسب ذیل ریزولیوشن پاس ہوا۔

سندھ پراونشل مسلم لیگ کے اس اجلاس کی رائے ہے کہ ہندوستان کے وسیع براعظم میں مستقل امن و امان قائم رکھنے، یہاں بسنے والی دو قوموں، یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے اپنے اپنے کلچر کو فروغ دینے، انہیں بغیر کسی رکاوٹ کے اپنی اپنی اقتصادی اور معاشرتی اصلاح کرنے اور انہیں سیاسی طور پر حق خود ارادیت عطا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان میں دو مختلف فیڈریشن قائم کئے جائیں جن میں سے ایک فیڈریشن مسلمانوں کا ہو اور دوسرا ہندوؤں کا۔

چنانچہ یہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ سے درخواست کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے کانسٹی ٹیوشن کا خاکہ مرتب کرے جس کی رُو سے مسلمانوں کی اکثریت کے صوبے، مسلم اکثریت رکھنے والی ریاستیں اور وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے، متحدہ طور پر ایک فیڈریشن کی صورت میں مکمل آزادی حاصل کر سکیں۔ اس فیڈریشن کو اس امر کی اجازت ہونی چاہیئے کہ اگر ضروری محسوس ہو تو بیرونِ ہند کی کسی اسلامی مملکت کو بھی فیڈریشن میں شریک کر سکے۔ اس فیڈریشن میں غیر مسلم اقلیتوں کو اسی قسم کے تحفظات عطا کئے جائیں گے جیسے ہندوستان کے غیر مسلم فیڈریشن میں مسلم اقلیتوں کو حاصل ہوں گے۔

(ہماری قومی جدوجہد ۱۹۳۸ء - از عاشق حسین بٹالوی - صفحہ ۱۵۸)

یہ قرارداد، سنہ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان کا گویا طائرِ پیش رس تھی۔ فرمائیے! تقسیم ہند کی تجویز کے متعلق اس سے زیادہ واضح دستاویزی ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز اور ہندو دونوں، پورے کے پورے ملک کو، واحد فیڈریشن کے شکنجے میں جکڑ دینے کی فکر کر رہے تھے، اور قائداعظم اس کی سخت مخالفت کرتے تھے۔

۲۵ مارچ ۱۹۳۹ء کو میرٹھ ڈویژنل مسلم لیگ کانفرنس کے اجلاس میں (نوابزادہ) لیاقت علی خان (مرحوم) نے اپنے خطبۂ صدارت میں پہلے کہا کہ "اگر فیڈریشن قائم ہو گیا تو یقین کیجئے کہ مسلمانوں کی حالت اچھوتوں جیسی ہو جائے گی"۔ اور آخر میں کہا کہ "اس مسئلہ کا حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ملک کو تقسیم کر لیا جائے"۔

(ہماری قومی جدوجہد ۱۹۳۹ء - از عاشق حسین بٹالوی - صفحہ ۹۶)۔

خان ولی خان نے اپنے انٹرویو میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ جناحؒ، انگریز کے آلہ کار تھے [illegible] کو کسی نے ماں کی گالی دی تو اس نے کہا کہ ان بدبختوں کو گالی دینے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔ بچے کو ماں کی گالی دینی چاہیئے۔ جوان کو بہن کی اور بوڑھے کو بیٹی کی۔ اسی استعارہ میں ہم یہ کہیں گے کہ محترم

انگریز اور جناحؒ

خان صاحب، جذبات کی شدت میں، جناحؒ کے خلاف الزام تراشی کا سلیقہ بھی بھول گئے۔ جناحؒ کو اگر انگریز پرست یا حکومت برطانیہ کا آلۂ کار کہا جائے تو اس کی تائید میں آپ کو کوئی سیکنڈ کرنے والا بھی نہیں ملے گا۔ اگر جناحؒ کی کسی ایک خصوصیت پر اپنے پرائے سب متفق ہیں تو وہ اس کی انگریز دشمنی ہے۔ میں نے اپنے پمفلٹ ——— حسنِ کردار کا نقشِ تابندہ ——— میں تفصیل سے لکھا ہے کہ وہ کس طرح انگریز گورنروں، اور وائسرائوں سے ٹکر لیتے رہے۔ اور اس کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب انہوں نے ہنوز، بین الاقوامی تو ایک طرف، ملک گیر اہمیت بھی حاصل نہیں کی تھی۔ وہ ہوم رول لیگ کے مقامی رکن تھے۔ بمبئی کے گورنر لارڈ سیڈنہم نے اہلِ ہند کے خلاف کچھ حقارت آمیز الفاظ کہے تو یہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح گرجے اور اپنی تقریر میں اس کا نام لے کر کہا کہ

> یہی ہے وہ رجعت پسند جس نے ایک عرصہ تک ہندوستان کے خزانے سے بیش بہا تنخواہیں وصول کیں اور اب یہ ایسی سازشوں کی راہ نمائی کر رہا ہے جو کسی شریف انسان کے لئے باعثِ فخر نہیں ہو سکتیں۔

اس کے بعد وہیں کے ایک اور گورنر ——— لارڈ ولنگڈن کی باری آئی جس نے مسلم لیگ کے اجلاس کو ناکام بنانے کی نہایت مکروہ کوشش کی تھی۔ جناحؒ نے اس کی الوداعی تقریب میں اس کا وہ حشر کیا جس کا زندہ ثبوت بمبئی کا "جناح میموریل ہال" اب تک ایستادہ ہے۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ اوف انڈیا ایکٹ کے تحت، ہندوستان کی واحد فیڈریشن بنانے کی اسکیم کی، مسلم لیگ نے کس شدت سے مخالفت کی تھی۔ انگریز چاہتا تھا کہ وہ اسکیم پروان چڑھ جائے۔ قائدِ اعظمؒ کو اس سے متفق کرنے کے لئے (بلکہ یوں کہیئے کہ خریدنے کے لئے) برطانیہ کے وزیرِ اعظم لارڈ رمزے میکڈانلڈ نے انہیں ذاتی ملاقات کے لئے بلایا اور کہا کہ "اگر ستھا ایک صوبے کا گورنر بن سکتا ہے تو کوئی اور بھی بن سکتا ہے۔ اگر ستھا لارڈ کا خطاب حاصل کر سکتا ہے تو کوئی اور بھی کر سکتا ہے"۔

اس نے سمجھا کہ یہ بہت بڑی قیمت ہے جس کے عوض جناح کو آسانی سے خریدا جا سکتا ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ جناح نے کیا کہا؟ انہوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور خاموشی سے وزیرِ اعظم کے کمرے سے باہر نکلنے لگے۔ اس پر وہ بڑا متعجب ہوا اور قائدِ اعظمؒ کو الوداعی الفاظ کہنے کے ساتھ یہ پوچھ ہی لیا کہ آپ کا ایسا ردِ عمل کیوں ہوا؟ ——— قائدِ اعظمؒ نے اس کے جواب میں انتہائی متانت سے کہا کہ

> اب میں آپ سے کبھی نہیں ملوں گا۔ آپ مجھے بکاؤ مال سمجھتے ہیں!

اس کے ساتھ ہی آپ یہ بھی سُن لیجیئے کہ اسی لارڈ لنلتھگو کے ساتھ کیا ہوا تھا جس کے متعلق خان صاحب نے

جناحؒ اور لنلتھگو

کہا ہے کہ اس نے قائدِ اعظمؒ کو وہ اسکیم بھجوائی تھی۔ ہوا یوں کہ اس نے (بہ حیثیت وائسرائے) وار کونسل مقرر کی اور اس میں مسلم لیگی وزراء، مولوی فضل الحق اور سر سکندر حیات خان کو بھی شامل کر لیا۔ مسلم لیگ نے وار کونسل کو بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا اور قائدِ اعظمؒ نے ان وزراء سے کہا کہ وہ اس سے مستعفی ہو جائیں۔ جب وائسرائے کو اس کا علم ہوا تو اس نے قائدِ اعظمؒ کو ملاقات کے لئے بلا بھیجا۔ ملاقات کے لئے گیارہ بجے صبح کا وقت مقرر تھا لیکن قائدِ اعظمؒ ٹیلیفون پر بار بار یاد دھانی کے باوجود سوا گیارہ بجے سے پہلے وائسر یگل لاج میں نہ پہنچے۔ وہاں پہنچ کر بغیر کسی معذرت کے وائسرائے سے ملاقات کا مقصد پوچھا۔ اس نے کہا کہ "آپ کو میرے بیان سے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں"۔ آپ کو معلوم ہے کہ قائدِ اعظمؒ نے اس کے جواب میں کیا کہا؟ آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور وائسرائے سے یہ کہتے ہوئے کہ۔ "مجھے آپ کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں"۔ ——— کمرے سے باہر نکل آئے۔

اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ممتاز ہندو لیڈر، مسٹر کانجی دوارکا داس نے اپنی کتاب (INDIA'S FIGHT FOR FREEDOM) میں لکھا ہے:۔

> یہ دیکھ کر دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑ اٹھتی ہے کہ ہندوستان میں مسٹر جناح کی قامت اور دیانت کا کم از کم ایک لیڈر تو ایسا تھا جس میں اس قدر صداقت اور بے باکی تھی کہ اس نے انگریز وائسرائے کے منہ پر کہہ دیا کہ وہ اسے کیا سمجھتا ہے، جبکہ باقی ہندوستانی لیڈر، جن میں کانگرس ہائی کمان بھی شامل ہے، اس وائسرائے کو "بہترین انگلش جنٹلمین" اور "بہترین عیسائی جنٹلمین" جیسے خطابات سے نواز کر اس کی چاپلوسی کر رہے تھے۔ (صفحہ ۳۵۲)

اس سے بہت پہلے، جریدہ اسٹیٹسمین نے اپنی اشاعت ۱۲ر جولائی ۱۹۴۱ء کے اداریہ میں لکھا تھا:۔

> یہی ایک لیڈر ہے جس نے ہمیشہ صداقتوں کو بے نقاب کیا ہے۔

اور مسز سروجنی نیڈو نے (قائدِ اعظمؒ کی زندگی میں) ان کے متعلق کہا تھا:۔

> میں بڑی مدت سے جناحؒ کو جانتی ہوں۔ ان کے متعلق خواہ کوئی رائے بھی قائم کی جائے لیکن میں یہ پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ انہیں کسی قیمت پر بھی خریدا نہیں جا سکتا۔

خان ولی خان کا یہ الزام (کہ قائدِ اعظمؒ انگریز کے اشارۂ ابرو کی طرف دیکھا کرتے تھے) کوئی نیا نہیں۔ ایک مرتبہ مسٹر گاندھی نے بھی ان کے خلاف ایسا ہی الزام لگایا تھا جب کہا تھا کہ

> مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے جناح صاحب کی امیدیں دولتِ برطانیہ سے وابستہ ہیں۔ کوئی چیز جو کانگرس کرے اور دے وہ انہیں مطمئن نہیں کر سکتی۔ (ہریجن۔ ۴ نومبر ۱۹۳۹ء)

قائدِ اعظمؒ نے کس شدت سے جواب دیا:۔

> یہ قطعی افترا اور مسلمانانِ ہند کی توہین ہے جس کا مسٹر گاندھی جیسے مرتبہ کی شخصیت کو مرتکب نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ میں مسٹر گاندھی کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مسلمانانِ ہند اپنی اور صرف اپنی طاقت پر بھروسہ

کئے ہوئے ہیں۔ ہم نے اپنے حقوق اور مفادات کے تحفظ کے لئے کانگریس اور برطانیہ دونوں کے خلاف آخری خندق تک لڑنے کا عزم کر رکھا ہے اور کسی دوسرے پر تکیہ نہیں کرنا چاہتے۔

(اسٹیٹسمین۔ کلکتہ۔ مورخہ ۹ر نومبر سنہ ۱۹۳۹ء)

خان صاحب فرماتے ہیں کہ یہ سازشی اسکیم ۱۲ر مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کو قائدِ اعظمؒ کے پاس بھیجی گئی تھی۔ اسی سنہ ۱۹۴۰ء کے شروع میں کچھ ایسا محسوس ہوا کہ ہندو اور انگریز، ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق مسلمانوں کے علی الرغم کوئی سکیم تیار کر رہے ہیں۔ اس پر قائدِ اعظمؒ نے راجکوٹ سے ایک بیان جاری کیا جس میں پُر جلال انداز میں کہا کہ

میں انتباہ کئے دیتا ہوں ——— اور مجھے اُمید ہے کہ وائسرائے اور حکومت برطانیہ پورے طور پر اس حقیقت کو سمجھ لیں گے کہ ماضی کی صورتِ حال کا اعادہ کیا گیا یا ان ضمانتوں کو پورا نہ کیا گیا جو دی جا چکی ہیں یا ان کا احترام ملحوظ نہ رکھا گیا تو ہندوستان میں نہایت خطرناک صورتِ حال پیدا ہو جائے گی۔ مسلم ہندوستان ان تمام ذرائع سے جو اس کے اختیار میں ہیں ایسی صورتِ حال کا مقابلہ کرے گا اور کسی قربانی سے دریغ نہیں کرے گا۔

۲۵ر فروری سنہ ۱۹۴۰ء کو دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا۔ قائدِ اعظمؒ نے سیاسی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ولولہ انگیز تقریر کی جس میں فرمایا:۔

لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ مسلم لیگ کا مطمحِ نظر کیا ہے؟ اگر آپ کو اب تک معلوم نہیں ہوا تو غالباً آئندہ بھی معلوم نہیں ہو سکے گا۔ بہر حال سُن لیجئے، معاملہ بالکل صاف ہے۔ برطانیہ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ مسٹر گاندھی اور کانگریس ہندوستان اور مسلمانوں دونوں پر حکومت کرنے کے خواہاں ہیں۔ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ ہم برطانیہ اور گاندھی میں سے کسی کو بھی مسلمانوں پر حکومت نہیں کرنے دیں گے۔ ہم آزادی چاہتے ہیں۔

اس سے بھی اہم اور مستند شہادت خود انگریز کے گھر کی ہے۔ (RUSHBROOK WILLIAMS) اپنی کتاب (THE STATE OF PAKISTAN) میں لکھتا ہے:۔

میرے بعض ہندوستانی دوست باصرار کہتے ہیں کہ پاکستان کی تخلیق انگریزوں کی انتہائی میکیاولی سیاست کی زندہ مثال ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب تم انگریزوں نے دیکھا کہ ہندوستان میں تمہاری حالت پتلی ہو رہی ہے تو تم نے، اپنی روایتی پالیسی ——— انہیں آپس میں لڑاؤ اور حکومت کرو ——— کے مطابق کانگریس کے مدِ مقابل مسلم لیگ کی پیٹھ ٹھونکی اور جناح کو اپنا آلۂ کار بنا کر، ملک کو تقسیم کر کے، ہمارے مستقبل کو مشتبہ بنا دینے کی مہم شروع کر دی۔

(رشبرک کہتا ہے کہ) اس الزام کی تردید میں، میں صرف دو دلائل پیش کروں گا۔ جو شخص جناح سے ذرا بھی واقف ہے وہ مجھ سے اس امر میں اتفاق کرے گا وہ (مسٹر جناح) اپنی پوری زندگی میں کسی کا آلۂ کار نہیں بنا ——— چہ جائیکہ وہ انگریزوں کا آلۂ کار بنتا! اور دوسرے

یہ کہ اس تمام دوران میں، انگریزوں نے — دہلی اور لندن، دونوں جگہ جس منظم انداز سے تقسیمِ ہند کی سکیم کو ناکام بنانے کی کوششیں کیں، وہ خود اس امر کی شہادت ہیں کہ انگریز کبھی تخلیقِ پاکستان کے حق میں نہیں ہو سکتا تھا۔ (صفحہ ۱۵)

انگریز کی یہ کوششیں کس طرح — آخری وقت تک جاری رہیں، اس کا اندازہ لارڈ مونٹ بیٹن کے اس اعتراف سے لگا لیجئے جو اس نے ۱۹۷۵ء کے اواخر میں، بی۔ بی۔ سی (لنڈن) سے براڈ کاسٹ کیا تھا۔ آن

لارڈ ماؤنٹ بیٹن

سے سوال کیا گیا تھا کہ "جب آپ ہندوستان گئے ہیں تو کیا اس وقت اس ملک کو متحد رکھنے کا کوئی امکان تھا؟ اس کے جواب میں اس نے کہا تھا:۔

میں ہندوستان گیا ہی اس مقصد کے لئے تھا کہ اسے کسی طرح متحد رکھ سکوں۔ ہم صدیوں کے بعد اس ملک کو چھوڑ رہے تھے تو چاہتے تھے کہ اسے ایک متحد ملک کی صورت میں چھوڑ جائیں۔ اگر ایسا ہو سکتا تو یہ ایک عظیم کارنامہ ہوتا۔ اس کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ایک الم انگیز حادثہ تھا جس سے ہندوستان کی قوت پارہ پارہ ہو جاتی تھی۔ لہٰذا، میں نے اس مقصد کے لئے انتہائی کوشش کی۔ لیکن اس کی راہ میں ایک ایسا شخص حائل تھا جو پہاڑ کی طرح رکاوٹ بنے کھڑا تھا۔ اور وہ تھا، محمد علی جناحؒ، صدر مسلم لیگ، جو شروع ہی سے یہ کہتا چلا گیا اور اس کے ارادے کو بدلنے کے لئے میری ہر کوشش ناکام رہ گئی۔ مجھے بالآخر اس کے سامنے جھکنا پڑا!۔ (طلوعِ اسلام۔ فروری ۱۹۷۶ء)

اس سے بھی آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اس الزام کی حقیقت کیا ہے کہ پاکستان انگریز کی سازش کا نتیجہ تھا جس کے لئے اس نے جناحؒ کو آلۂ کار بنایا تھا!

—(۰)—

اب آپ خان عبدالولی خان صاحب کے ترکش کے آخری تیر کو لیجئے جس کی رُو سے وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے انگریز کو ہندوستان سے نکالا تھا اور یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ بالفاظ دیگر اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ (اور ان کے ہمنوا حضرات) تو انگریزوں کو

انگریزوں کا نکالنا

ہندوستان سے نکالنا چاہتے تھے، اور قائدِ اعظمؒ اور مسلم لیگ سے متعلق حضرات) "ٹوڈی بچے" تھے جو انگریزوں کے زیرِ حکومت غلامی کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ سمجھنے کی ہے کہ (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں، مسلمانوں کی ایک آزاد مملکت کا تصور پیش کیا تھا اور اسی تصور نے پھر آگے چل کر مطالبۂ پاکستان کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ایک عام سمجھ بوجھ کا انسان بھی اس سے اتفاق کرے گا کہ انگریزوں کی ہندوستان میں موجودگی میں، مسلمانوں کی آزاد حکومت کا امکان ہی نہیں تھا۔ اس قسم کی آزاد حکومت تو لامحالہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ہی وجود میں آسکتی تھی۔ ۱۹۳۰ء میں یہ تو کہا جا سکتا تھا کہ ہم اس آخری منزل تک بتدریج پہنچ سکیں گے لیکن مسلمانوں

کی آزاد حکومت تو بہرحال انگریز اور ہندو، دونوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد ہی قائم ہوسکتی تھی!

اب اس مسئلہ کے دوسرے گوشے کی طرف آیئے۔ ہندوؤں کا مقصد یہ تھا کہ انگریز وہاں سے چلا جائے اور ملک متحد رہے۔ نیشنلسٹ مسلمان بھی ان کے ہم نوا تھے۔ ایسی صورت میں وہاں کے مسلمانوں کی حالت کیا ہوتی، اس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے ۱۹۲۷ء میں، وضاحت کر دی تھی۔ حکیم محمد حسن قرشی (مرحوم) نے حضرت علامہؒ سے اپنی ایک ملاقات کا حال لکھا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ وسط دسمبر ۱۹۲۷ء کی ایک شام، وہ اور حکیم جلال الدین (مرحوم) حضرت علامہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس زمانے میں ہندوستان میں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ میں نے علامہ صاحب سے کہا:۔

> یہ ظاہر ہے کہ اسلام اور غلامی میں نسبتِ تضاد ہے۔ اسی لئے قرآنِ حکیم میں محکوم مسلمانوں کے لئے کوئی ضابطۂ حیات تجویز نہیں کیا گیا۔ بلکہ غلامی کو تعزیر و عقوبت قرار دیا گیا ہے۔ اس حالت میں مسلمانوں کا فرض ہے کہ موجودہ جہادِ آزادی میں مقدمۃ الجیش کی حیثیت سے معرکہ آرا ہوں۔

اس کے جواب میں:۔

> حضرت علامہؒ نے فرمایا کہ مجھے اس سے اتفاق ہے کہ مسلمانوں کو جنگِ آزادی میں پیش پیش ہونا چاہیئے مگر سوال تو یہ ہے کہ کیا موجودہ تحریک کے نتیجے میں مسلمان آزاد ہو سکیں گے؟ مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان انگریز کی جگہ ہندو کے غلام ہو جائیں گے۔ اس سے کیا فائدہ مرتب ہوگا۔
>
> (اوراقِ گم گشتہ۔ از رحیم بخش شاہین۔ صفحہ ۱)

یہ مختصر سا جواب ہندو کی اس سازش کو بے نقاب کرنے کے لئے دیا گیا تھا جس میں وہ آزادی کے دامِ ہم رنگِ زمیں میں مسلمانوں کو پھنسانا چاہتا تھا۔ ہندو کی سازش یہ تھی کہ انگریز ہندوستان سے نکل جائے تو وہاں مغربی انداز کا جمہوری نظام قائم کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس نظام میں حکومت، اکثریت کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ ہندوستان کی آبادی میں ہندو اکثریت میں تھا اور مسلمان اقلیت میں۔ اور ہندو کی یہ اکثریت غیر متبدّل (INCONVERTIBLE) تھی۔ یعنی ایسا ہو نہیں سکتا تھا کہ ہندو کبھی اقلیت میں ہو جائے اور مسلمان اکثریت میں۔ لہٰذا، اس جمہوری حکومت میں مسلمان کو ابدی طور پر ہندو کا محکوم رہنا تھا۔ (جیسا کہ اس وقت وہاں ہو رہا ہے) مسلمان نیشنلسٹ، اس باب میں ہندو کے ہم نوا تھے۔ اس حقیقت کی روشنی میں آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ ہندو کی سکیم کی رُو سے انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دینے کا "جہادِ عظیم" مسلمانوں کے حق میں کیا معنی رکھتا تھا؟ اور نیشنلسٹ مسلمانوں کا وہ کارِ نمایاں جس کا احسان وہ قدم قدم پر جتاتے اور اہلِ پاکستان سے اس کا صلہ مانگتے ہیں! یہ تو ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہاں اقبالؒ اور جناحؒ پیدا ہو گئے۔ ورنہ نیشنلسٹ مسلمانوں نے تو مسلمان قوم کو ابدی طور پر ہندو کا غلام بنا کر رکھ دینا تھا!

اس کے بعد جب علامہ اقبالؒ نے سن ۱۹۳۰ء میں پاکستان کا تصور پیش کیا تو یہ بھی واضح کر دیا کہ اسلام

کے نقطۂ نگاہ سے غلامی اور آزادی کا مفہوم کیا ہے؟ غیر مسلموں (بلکہ یوں کہیئے کہ سیکولرزم کے حامیوں) کے نزدیک، اگر کسی ملک پر، کسی دوسری قوم کی حکومت ہے تو یہ غلامی ہے۔ اگر اس پر خود ان کی اپنی حکومت ہے تو اسے آزادی کہا جائے گا۔ علامہ اقبالؒ نے بتایا کہ اسلام کے نقطۂ نگاہ سے غلامی اور آزادی کا مفہوم اس سے مختلف ہے۔ اس کے نزدیک، غلامی اور آزادی کا تعین اس سے نہیں ہوتا کہ اس ملک پر اپنی قوم کی حکومت ہے یا کسی دوسری قوم کی حکومت — اسلام کے نقطۂ نگاہ سے غلامی اور آزادی کا معیار یہ ہے کہ اگر اس ملک میں خدا کی کتاب کی حکمرانی ہے تو مسلمانوں کو آزادی حاصل ہے۔ اگر حکومت انسانوں کی ہے (خواہ وہ اپنی قوم کے ہوں اور خواہ کسی دوسری قوم کے) تو وہ غلامی ہے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی میں اصل کش مکش کی بنا ہی یہ تھی۔ اور یہ کش مکش ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہی نہیں تھی۔ اس میں ہندو اور نیشنلسٹ مسلمان ایک طرف تھے اور علامہ اقبالؒ۔ قائد اعظمؒ اور ان کے ہم نوا ان کے مدمقابل، دوسری طرف — اور حیرت یہ ہے کہ ان نیشنلسٹ مسلمانوں میں حضرات علماء کرام بھی شامل تھے۔ علامہ اقبالؒ کی زندگی کے آخری ایام میں، دیوبند کے شیخ الحدیث، مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ساتھ ان کا جو معرکہ ہوا تھا، اس میں بنائے نزاع یہی سوال تھا۔ مولانا مدنیؒ نے یہ کہا تھا کہ آزادی حاصل کرنا مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے اسلئے اس مقصد کے لئے مسلمانوں کو ہندوؤں کا ساتھ دینا چاہیئے۔ اس کے جواب میں حضرت علامہؒ نے جو کچھ فرمایا وہ اسلامی اور غیر اسلامی تصور آزادی میں خط امتیاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے فرمایا تھا:۔

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں، بلکہ ہمارا اول مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے۔ ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا۔ بولنا۔ روپیہ صرف کرنا۔ لاٹھیاں کھانا۔ جیل جانا۔ گولی کا نشانہ بننا سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہے۔
>
> (معرکۂ دین و وطن)

ظاہر ہے کہ دین کی جو علم ایک شیخ الحدیث کی سمجھ میں نہیں آئی تھی وہ خان عبدالولی خان کی سمجھ میں کس طرح آ سکتی ہے؟

(۰)

آخر میں آیئے سر ظفر اللہ خان کے اس نوٹ کی طرف جو اس بحث کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ خان عبدالولی خان

سر ظفر اللہ کا نوٹ

سنے اپنے اس انٹرویو میں (رجحان بابت ۲۱ر دسمبر ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا) کہا تھا کہ انگریز کو روس کی طرف سے بڑا خطرہ تھا۔ پہلے اس نے کوشش کی کہ ہندو کو روس سے لڑا دے۔ لیکن وہ اس میں ناکام رہا تو اس نے سوچا کہ ہندو کو مسلمان سے لڑا کر، برصغیر کی تقسیم کی راہ ہموار کرلے۔ چنانچہ اس نے ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق ہندو لیڈروں کو مسلم قوت کے خلاف کھڑا کر دیا۔ جہاں تک تقسیمِ ہند کا تعلق تھا،

> اس مشکل کا حل اس مذہبی طبقے نے نکالا جو انگریز ہی کا "خود کاشتہ پودا" تھا۔ جو بظاہر مسلم سوسائٹی کا ایک حصہ تھا مگر در پردہ اسلام کی قوتِ حاکمیہ اور مسلمانوں کے ملی اقتدار کا سخت مخالف تھا۔ اُسے انگریز نے اسی کام کے لئے تیار کیا تھا کہ وہ اسلام کے گھر میں نقب لگا کر مسلمانوں کی اجتماعی رسوائی کا سامان فراہم کرے۔ اس پولیٹیکل تنظیم کو انگریز کی طرف سے ہر طرح کی اعانت حاصل تھی۔ یہ اس کی پرانی نمک خوار تنظیم تھی۔ اس تنظیم کا لیڈر مسٹر ظفر اللہ خان آگے بڑھا اور اس نے گورنمنٹ برطانیہ کی ذہنی پریشانی دور کر دی۔ اس نے برصغیر کی تقسیم کا "قابلِ عمل" فارمولا تیار کیا اور اس کا مسودہ وائسرائے لارڈ لنلتھگو کے سپرد کر دیا۔۔۔۔ مسٹر ظفر اللہ نے حکومتِ برطانیہ سے درخواست کی کہ مسلم لیگ اور اس کے قائدین کو اس بات سے آگاہ نہ کیا جائے کہ اس مسودہ کا خالق وہ ہے۔

اس کے بعد خان عبدالولی خان نے اپنے اس خط میں، جو انہوں نے ملتان کے ایک شہری محمد شریف صاحب کے نام لکھا تھا (اور جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے) اس اسکیم کی وضاحت ان الفاظ میں کی :-

> جب وائسرائے لارڈ لنلتھگو، مسلم لیگی لیڈروں کو اپنا ہم خیال بنانے میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے اپنی ایگزیکٹو کونسل کے ایک رکن، مسٹر ظفر اللہ خان کی خدمات حاصل کیں اور اُسے ہدایت کی کہ وہ برصغیر کی تقسیم اور قیامِ پاکستان کی ایک اسکیم تیار کرے۔ اس سے قبل زبانی طور پر تو ایک علیٰحدہ مسلم ریاست کی باتیں کی جا رہی تھیں لیکن کوئی تحریری دستاویز موجود نہ تھی۔ اس لئے وائسرائے کی ہدایت کے مطابق مسٹر ظفر اللہ خان نے ایک تجویز تیار کی، جسے قرارداد کی شکل میں منظور کر لیا گیا۔ (رجحان۔ یکم فروری تا ۸ر فروری ۱۹۸۲ء۔ صفحہ ۲۲)

خان ولی خان کا (۲۱ر دسمبر کا) انٹرویو شائع ہونے کے فوری بعد، سر ظفر اللہ خان نے ان کے الزام کی تردید کی اور (۲۷ر دسمبر ۱۹۸۱ء کے روزنامہ جنگ (لاہور) میں شائع شدہ اپنے بیان میں کہا کہ

> میں نے تقسیمِ ہند کے متعلق کبھی کوئی فارمولا وائسرائے ہند، لارڈ لنلتھگو کو پیش نہیں کیا تھا۔

لیکن اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد اخبارات میں سر ظفر اللہ خان کا وہ طویل طویل نوٹ شائع ہو گیا جو انہوں نے لارڈ لنلتھگو کو دیا تھا۔ (دیکھئے پاکستان ٹائمز مورخہ ۲۳ر جنوری ۱۹۸۲ء)۔ اس پر سر ظفر اللہ خان نے ایک بیان شائع کیا جس میں تسلیم کیا کہ انہوں نے واقعی لارڈ لنلتھگو کو تقسیمِ ہند کی اسکیم پیش کی تھی جس کی کاپی قائدِ اعظمؒ کو بھی بھیجی گئی تھی۔ (ملاحظہ ہو پاکستان ٹائمز مورخہ ۱۳ر فروری ۱۹۸۲ء) یعنی پہلے

صاف مُکر گئے اور جب وہ نوٹ اخبارات میں شائع ہوگیا تو اس کا اعتراف کرنا پڑا لیکن وہ بھی اس امر کی معذرت کئے بغیر کہ انہوں نے جو بیان پہلے دیا تھا وہ غلط تھا۔ اس اثناء میں، لندن میں پاکستانی سفارت خانہ کے منسٹر انفارمیشن قطب الدین عزیز صاحب کا ایک انٹرویو، روزنامہ جنگ (لاہور) کی ۱۲ فروری ۱۹۸۲ء کے میگزین ایڈیشن میں شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے سر ظفر اللہ خان کے نوٹ (مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء) کا ملخص پیش کیا ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ سر ظفر اللہ خان نے پاکستان سکیم کو مسترد کرتے ہوئے، اپنی تجویز پیش کی تھی جسے وہ علیحدگی کی اسکیم (SEPARATION) سے تعبیر کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے نوٹ میں لکھا تھا:۔

> ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان اسکیم کے مقابلہ میں جس منصوبہ کو حال میں سب سے زیادہ حمایت حاصل ہوئی ہے وہ "علیحدگی کا منصوبہ" ہے۔ پاکستان اسکیم اور علیحدگی کی اسکیم میں جو بڑا فرق ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان اسکیم کے تحت تبادلۂ آبادی اشد ضروری ہے اور علیحدگی کی اسکیم میں ایسا کوئی ناممکن اور غیر عمل منصوبہ شامل نہیں۔ مختصراً علیحدگی کی اسکیم کا تصوّر یہ ہے کہ برّصغیر کے شمال مشرق میں ایک وفاق ہو جس میں بنگال اور آسام کے صوبے شامل ہوں اور شمال مغرب میں ایک اور وفاق ہو جس میں پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان اور سرحد کے قبائلی علاقے شامل ہوں۔ ہندوستان کے باقی علاقے اسی طرح یا تو ایک واحد یا متعدد وفاق بنالیں۔ شمال مشرق اور شمال مغرب کے وفاق تاجدارِ برطانیہ سے متعلق ہوں گے۔ اسی طرح بقایا ہندوستان میں جو وفاق یا متعدد وفاق قائم ہوں وہ بھی تاجدارِ برطانیہ سے متعلق ہوں گے۔

قبل اس کے کہ ہم سر ظفر اللہ خان کی اسکیم اور قرارداد پاکستان کا مقابلہ کریں، ایک اور واقعہ سامنے لانا بھی ضروری ہے۔ ۹ فروری ۱۹۸۲ء کے روزنامہ جنگ (لاہور) میں وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو کی ڈائری کا ایک ورق چھپا ہے جس میں قائدِ اعظمؒ کی وائسرائے کے ساتھ اس طویل ملاقات کا تذکرہ ہے جو ۴ ستمبر ۱۹۳۹ء کو ہوئی تھی...... (اس تاریخ یعنی ۴ ستمبر ۱۹۳۹ء کو ذہن میں رکھئے کیونکہ سر ظفر اللہ خان کا نوٹ ۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو بھیجا گیا تھا)۔ وائسرائے نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے:۔

> میں نے مسٹر جناحؒ سے معلوم کیا کہ آپ اپنے حالیہ بیان کے بارے میں بتائیے جس میں آپ نے کہا ہے کہ اب آپ ہندوستان کے لئے جمہوری حکومت پر یقین نہیں رکھتے۔ اگر جمہوری حکومت اس ملک کے لئے نامناسب ہے تو اسے کس طرح خود مختاری اور آزادی حاصل ہو سکتی ہے...؟ آپ کی اس پالیسی سے انڈیا میں مستقل فرقہ وارانہ جنگ ہوتی رہے گی۔ مسٹر جناحؒ نے جواب دیا کہ اس تعطل سے بچنے کے لئے واحد راہ تقسیم ہند ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ اگر تفصیل جائزہ لیا جائے

حٰ ...۔ سر ظفر اللہ خان نے کہا ہے کہ جس پاکستانی اسکیم کی انہوں نے مخالفت کی تھی اس سے مراد چوہدری رحمت علی مرحوم کی اسکیم تھی۔

توتقسیم اس کا عملی حل نہیں۔ مسٹر جناحؒ نے برجستہ جواب دیا۔ "برما کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ لوگ بہت خوش ہیں"۔

اس کے بعد قائداعظمؒ ۶ فروری ۱۹۴۰ء کو پھر لارڈ لنلتھگو سے ملے اور اسے بتایا کہ مسلم لیگ کا جو اجلاس مارچ ۱۹۴۰ء کو ہو رہا ہے، اس میں تقسیم ہند کا مطالبہ پیش کیا جائے گا۔ (چوہدری خلیق الزمان کی کتاب "پاتھ وے ٹو پاکستان"۔ صفحہ ۲۳۴۔ بحوالہ پاکستان ٹائمز۔ مورخہ ۲۶ فروری ۱۹۸۲ء)۔

ان حقائق سے دو باتیں واضح ہیں۔ ایک تو یہ کہ قائداعظمؒ نے لارڈ لنلتھگو پر ستمبر ۱۹۳۹ء اور فروری ۱۹۴۰ء میں واضح کر دیا تھا کہ مسلم لیگ کا مطالبہ تقسیم ہند کا ہے۔ لہٰذا، یہ کہنا صحیح نہیں کہ ان کے ذہن میں تقسیم ہند کا سوال مارچ ۱۹۴۰ء میں سر ظفر اللہ خان کے نوٹ سے پیدا ہوا۔ اور دوسرے یہ کہ تقسیم سے اُن کی مراد مسلمانوں کے لئے آزاد مملکت کا قیام تھا۔

سر ظفر اللہ خان نے اپنی وضاحت (شائع شدہ ۱۳ فروری ۱۹۸۲ء) میں کہا ہے کہ

> قراردادِ پاکستان، بالکل (EXACTLY) میری علیحدگی کی اسکیم کے مطابق تھی۔

اس سے وہی مغالطہ دینے کی کوشش کی گئی ہے جس کا تاثر ولی خان صاحب نے پیدا کرنا چاہا تھا۔ ظفر اللہ خان صاحب کی علیحدگی کی اسکیم اور قراردادِ پاکستان میں ایک بنیادی فرق ہے۔ علیحدگی کی اسکیم میں، مسلمانوں کے دونوں وفاق تاجدارِ برطانیہ سے وابستہ رہتے ہیں اور قراردادِ پاکستان میں مسلمانوں کی آزاد مملکتوں کا مطالبہ ہے۔ ایک آزاد مملکت اور تاجِ برطانیہ سے وابستہ وفاق میں جو بنیادی فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ قائداعظمؒ کسی صورت میں بھی ایسے پاکستان کو قبول نہیں کر سکتے تھے جو کاملۃً آزاد نہ ہو۔ (اور تاجِ برطانیہ سے وابستہ رہے)۔ یہی تو وہ فرق تھا جس کی وجہ سے حکومتِ برطانیہ آخری وقت تک پاکستان کی مخالفت کرتی رہی۔ اور (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) قائداعظم برابر اعلان کرتے رہے کہ

> برطانیہ، ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ مسٹر گاندھی اور کانگریس ہندوستان اور مسلمانوں پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم — نہ انگریز کو مسلمانوں پر حکومت کرنے دیں گے، نہ مسٹر گاندھی کو۔ ہم آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ (آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس منعقدہ ۲۵ فروری ۱۹۴۰ء سے خطاب)
> (تقاریر قائداعظمؒ۔ جلد اول۔ صفحہ ۱۵۱)

۱؎ قائداعظمؒ نے وار کونسل کے سلسلہ میں جو کچھ لارڈ لنلتھگو کے ساتھ کیا تھا، اسے ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ اس مقام پر ایک اور چشمک ملاحظہ فرمائیے۔ "وسط ستمبر ۱۹۳۹ء میں وائسرائے نے مسٹر جناحؒ سے کہا کہ انہوں نے مسٹر گاندھی کو بلایا ہے، آپ بھی تشریف لائیے۔ مسٹر جناحؒ نے جواب دیا کہ میں ان دنوں بہت مشغول ہوں۔ یکم اکتوبر سے پہلے نہیں آ سکتا۔ اس سخت جواب سے سر سکندر حیات اور سر ظفر اللہ خان بہت ناخوش ہوئے"۔ (جنگ لاہور۔ ۹ فروری ۱۹۸۲ء)

ضمناً۔ سر ظفر اللہ خان نے جو اسکیم پیش کی تھی وہ بھی کوئی انوکھی اسکیم نہیں تھی۔ مسلم لیگ کے تقسیم ہند کے اصولی فیصلے کے بعد، اس کی تفصیلات کے متعلق ۱۹۳۹ء میں ملک میں متعدد اسکیمیں گردش کر رہی تھیں۔ (مثلاً) (۱) ڈاکٹر سید عبد اللطیف حیدر آبادی (مرحوم) کی اسکیم۔ (۲) "ایک پنجابی" (میاں کفایت علی) کی اسکیم۔ (۳) چوہدری رحمت علی (مرحوم) کی اسکیم۔ (۴) علی گڑھ اسکیم (جسے وہاں کے دو پروفیسرز؛ ڈاکٹر سید ظفر الحسن اور ڈاکٹر افضال حسین قادری نے مرتب کیا تھا)۔ اور (۵) سر سکندر حیات خان (مرحوم) کی اسکیم۔ ان تمام اسکیموں کو مسلم لیگ کی کانسٹی ٹیوشن سب کمیٹی نے مسترد کر دیا تھا کیونکہ وہ لیگ کے مطمحِ نگاہ —— ہندوستان سے کاملتہً علیحدگی اور مکمل آزادی —— پر پوری نہیں اترتی تھیں۔ اسی انداز کی سر ظفر اللہ خان کی اسکیم بھی تھی جسے (انہوں نے قائدِ اعظمؒ کے پاس بھیجا بھی ہوگا تو) لیگ نے مسترد کر کے اپنی اسکیم منظور کی تھی۔

——————(○)——————

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہے کہ

(۱) مسلمانانِ ہند کے لئے ایک الگ، آزاد مملکت کا تصوّر، علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں دیا تھا تاکہ اس میں قرآنی حکومت کا قیام عمل میں لایا جا سکے۔

(۲) ان کے اس تصوّر کا چرچا اُسی زمانہ میں عام ہو گیا تھا، اور لندن کے نامور سیاسی مشاہیر تک کے کانوں میں یہ آواز پہنچ چکی تھی۔

(۳) علامہ اقبالؒ نے اسی زمانے سے قائدِ اعظمؒ کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوششیں شروع کر دی تھیں اور وہ ان سے بالآخر متفق ہو گئے تھے۔ انہوں نے ۱۹۳۶-۳۷ء میں جو خطوط قائدِ اعظمؒ کو لکھے تھے ان میں تقسیمِ ہند اور مسلمانوں کے لئے ایک آزاد اسلامی مملکت کی تجویز نمایاں تھی۔

(۴) قائدِ اعظمؒ نے بھی اس مطالبہ کو پیش کرنا شروع کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ سندھ پراونشل مسلم لیگ کانفرنس (منعقدہ اکتوبر ۱۹۳۸ء) میں اس امر کی ایک قرارداد بھی منظور کر لی گئی تھی۔

(۵) انہوں نے ۱۹۳۹ء میں لارڈ لنلتھگو، (وائسرائے ہند) سے بھی واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ ہندوستان کے مسائل کا حل تقسیمِ ملک اور مسلمانوں کی آزاد مملکت کے سوا کچھ نہیں۔

(۶) اسی کے مطابق ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قراردادِ لاہور پاس ہوئی تھی۔

(۷) سر ظفر اللہ خان نے تقسیم کی جو تجویز وائسرائے کو پیش کی تھی وہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ لیکن اس میں اور قراردادِ لاہور میں بنیادی فرق تھا۔

(۸) لہٰذا، یہ کہنا خلافِ حقیقت ہے کہ قائدِ اعظمؒ نے سر ظفر اللہ خان کے اٗوٹ سے یہ خیال اخذ کر کے اس کے مطابق قراردادِ لاہور منظور کرا دی تھی۔

اور سب سے بڑی اور منفرد بات یہ کہ تصوّرِ پاکستان نہ کسی ظفر اللہ خان کی اپج تھی، نہ کسی لنلتھگو کی سازش —— حتیٰ کہ نہ اقبالؒ کے ذہن کی تخلیق تھا، نہ قائدِ اعظمؒ کے تخیّل کا رہینِ منّت۔ یہ ہمارے

دین کا تقاضا تھا جسے ہمارے زمانے میں علامہ اقبالؒ نے سمجھا اور جس کے مطابق قائدِ اعظمؒ نے ایک عظیم مملکت حاصل کر کے ہمارے حوالے کر دی کہ ہم بے کار بیٹھے یہ گتھیاں سلجھاتے اور وساوس پھیلاتے رہیں کہ تصورِ پاکستان کا خالق کون تھا؟ جس مقصد کے لیے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا، اگر اس کے مطابق یہاں حکومت قائم ہو جاتی۔۔۔ یعنی یہ "پہلے اور حقیقی پاکستان" کا نقشِ ثانی بن جاتا ــــ تو جن لوگوں نے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی تھی انہیں اس قسم کے اعتراضات کا موقعہ ہی نہ ملتا۔ اس مملکت کا وجود اس سوال کا زندہ جواب ہوتا کہ اس کے قیام کا جذبۂ محرکہ کیا تھا؟.....

(جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے) ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ ہمارے ہاں نہ تحریکِ پاکستان کی کوئی مستند تاریخ مرتب ہوئی ہے، نہ قائدِ اعظم کے قابلِ اعتماد سوانحِ حیات۔ (اور یوں نظر آتا ہے کہ ایسا دانستہ کیا گیا ہے کیونکہ اس قسم کی حقیقی اور مستند دستاویزات کی موجودگی میں نہ کسی کے لئے کسی قسم کی من مانی کرنے کی گنجائش ہوتی، نہ اپنی ہر اسکیم کو اسلامی کہہ کر پیش کرنے کی جرأت۔ ایسی تاریخ مرتب نہ ہوئی اور) وہ لوگ آہستہ آہستہ اٹھتے جا رہے ہیں جو اس معرکہ میں خود شریک تھے۔ اس کے بعد کوئی یہ بتانے والا بھی نہیں رہے گا کہ ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا؟ اس طرح حقیقت خرافات میں کھو جائے گی اور اس کی جگہ افسانے لے لیں گے۔ یہی کچھ پہلے حقیقی "پاکستان" کے ساتھ ہوا تھا، یہی کچھ اس خطۂ زمین کے ساتھ ہوگا جسے "پاکستان" بنانے کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔

بایں ہمہ، خدا کی کتاب، یہ بتانے کے لئے زندہ اور پائندہ رہے گی کہ حقیقی پاکستان کا قیام کس طرح دین کا تقاضا ہے۔ اس کتابِ عظیم کے مطابق "پاکستان" بہرحال قائم ہونا ہے ــــ یہاں نہ سہی، کہیں اور سہی۔ (اقبالؒ کے الفاظ میں)، ے

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است　　ساز قرآں را نوا ہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر　　آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
ذکرِ حق از امتاں آمد غنی!　　از زمان و از مکاں آمد غنی!
ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جدا است　　احتیاج روم و شام او را کجا است
حق اگر از پیش ما بردار دش　　پیش قومے دیگرے بگذار دش
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن　　ہر زماں جانم بلرزد در بدن
ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند!

(جاوید نامہ۔ صفحہ ۹۱)

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ع (۴۷/۳۸)

اگر تم روگردانی کرو گے تو اللہ تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئیگا۔ اور وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔

اقبالؒ ہی نے دوسرے مقام پر اس الم انگیز نوحہ کو ایک مصرعہ میں سمو کر رکھ دیا ہے

داستان کا کیا پوچھتے ہو، وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ

خوابم ز یاد رفتہ و تعبیرم آرزو ست

میں نے ایک خواب دیکھا تھا جو بھول چکا ہے۔ اور میں اس بھولے ہوئے خواب کی تعبیر لوگوں سے پوچھتا پھرتا ہوں! آج جو اس قسم کے سوالات پوچھے جا رہے ہیں کہ حصولِ پاکستان سے مقصد کیا تھا؟..... اسلامی نظام ہوتا کس قسم کا ہے!..... اسلامی مملکت کی امتیازی خصوصیت کیا ہے..... تو یہ سب "ایک بھلائے ہوئے خواب کی تعبیریں دریافت کرنے کی سعی لاحاصل ہے۔

ان سوالات کا جواب قرآن سے مل سکتا تھا لیکن قرآن سے اس قوم کو اس طرح ڈر لگتا ہے جس طرح دربارِ فرعون کے مذہبی پیشوا عصائے کلیمی سے لرزاں و ترساں تھے کہ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ... (۷/۱۱۷)

"وہ ان کی افترا پردازیوں کو نگل جائے گا"۔

لیکن یہ ساحرین، اپنی شعبدہ بازیوں کو کب تک بچائے رکھیں گے۔ انہوں نے ایک دن مٹنا ہے۔

رات کے ماتھے پہ افسردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے

اُس وقت نہ کسی فرعون کی آمریت باقی رہے گی، نہ کسی ہامان کی عبودیت۔ نہ کسی سامری کی فسوں سازیاں وجہ ابلہ فریبی ہوں گی، نہ کسی قارون کی استحصال انگیزیاں۔ اس وقت حکومت صرف خدا کی کتاب کی ہو گی۔ وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا... اور یوں "زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی"۔ اس وقت اندھے بھی دیکھ لیں گے کہ جس "پاکستان" کا تصور اقبالؒ نے پیش کیا تھا وہ کس قدر حیات بخش اور انسانیت ساز ہوتا ہے۔

آ! اے میری بے چین نگاہوں کے سہارے
مدت سے تیری راہ گذر دیکھ رہا ہوں!

مطالبۂ پاکستان اور تشکیلِ پاکستان کے بعد کے عواقب کی پوری داستان قرآن کریم کی اس ایک آیت میں سمٹی ہوئی ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ .... هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۲۴/۵۵)

جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھیں اور اس کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق کام کریں ان سے خدا نے وعدہ کر رکھا ہے کہ انہیں مملکت عطا کی جائے گی جس طرح اس پروگرام پر عمل کرنے والی سابقہ اقوام کو مملکت عطا کی گئی تھی۔ اس مملکت کا مقصود یہ ہو گا کہ خدا کے پسندیدہ دین کو تمکن حاصل ہو۔ ان لوگوں کا خوف امن سے بدل جائے۔ وہ اس قابل ہو جائیں کہ صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت کریں اور دنیا کی کوئی طاقت انہیں مجبور نہ کر سکے کہ وہ قوانینِ خداوندی کے ساتھ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی اطاعت کریں۔

جو لوگ ایسی مملکت حاصل ہو جانے کے بعد اس کے اس مقصد و منتہیٰ سے انکار کر دیں، اور قوانینِ خداوندی کے بجائے اپنے قوانین نافذ کرنے لگ جائیں، تو انہیں اس سے محروم کر دیا جائے گا۔

(۰)